مقالات

اسلام کا اخلاقی نقطۂ نظر

یہ مقالہ ۲۶ مارچ ۱۹۴۴ء کو اسلامیہ کالج پشاور میں پڑھا گیا تھا

معمولی حالات میں، جبکہ زندگی کا دریا سکون کے ساتھ بہ رہا ہو، انسان ایک طرح کا اطمینان محسوس کرتا ہے، کیونکہ اوپر کی صاف شفاف سطح ایک پردہ بن جاتی ہے جس کے نیچے تہ میں بیٹھی ہوئی گندگیاں اور غلاظتیں چھپی رہتی ہیں اور پردے کی اوپری صفائی آدمی کو اس بات کا تجسس کرنے کی ضرورت کم ہی محسوس ہونے دیتی ہے کہ تہ میں کیا کچھ چھپا ہوا ہے اور کیوں چھپا ہوا ہے لیکن جب اس دریا میں ہیجان اور طوفان برپا ہوتا ہے اور نیچے کی چھپی ہوئی ساری گندگیاں اور غلاظتیں ابھر کر برسرِ عام سطح دریا پر بہنے لگتی ہیں، اس وقت اندھوں کے سوا ہر وہ شخص جس کے دیدوں میں کچھ بھی بینائی کا نور باقی ہے، ہر اشتباہ کی گنجائش کے بغیر صاف صاف دیکھ لیتا ہے کہ زندگی کا دریا یہ کچھ اپنے اندر لئے ہوئے چل رہا ہے، اور یہی وہ وقت ہوتا ہے جب عام انسانوں میں اس ضرورت کا احساس پیدا ہو سکتا ہے کہ اُس منبع کا سراغ لگائیں جہاں سے دریائے زندگی میں یہ گندگیاں آ رہی ہیں اور اس تدبیر کی جستجو کریں جس سے اس دریا کو پاک کیا اور رکھا جا سکے۔ فی الواقع اگر ایسے وقت میں بھی لوگوں کے اندر اس ضرورت کا احساس بیدار نہ ہو تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ نوعِ انسانی اپنی غفلت کے نشے میں مدہوش ہو کر سود و زیاں سے بالکل ہی بے فکر ہو چکی ہے۔

یہ زمانہ جس سے ہم آج کل گذر رہے ہیں ایسے ہی غیر معمولی حالات کا زمانہ ہے۔ زندگی کا دریا اس وقت اپنی طغیانی پر ہے، ملک ملک اور قوم قوم کے درمیان سخت کشمکش برپا ہے اور یہ کشمکش اتنی گہرائی تک اتری ہوئی ہے کہ بڑے بڑے مجموعوں سے گذر کر فرد فرد تک کو نزاع کے میدان میں کھینچ لائی ہے۔ اس طرح عالمِ انسان کے

بیش تر حصہ نے اپنے وہ تمام اخلاقی اوصاف اُگل کر منظر عام پر رکھ دیئے ہیں جنہیں وہ مدتوں سے اندر ہی اندر پرورش کر رہا تھا۔ اب ہم اُن گندگیوں کو علانیہ سطح زندگی پر دیکھ رہے ہیں جن کو تلاش کرنے کے لیے پہلے کچھ نہ کچھ تعمق کی ضرورت تھی۔ اب صرف ایک مادرزاد اندھا ہی اس غلط فہمی میں مبتلا رہ سکتا ہے کہ "بیمار کا حال اچھا ہے"، اور صرف وہی لوگ بیماری کی تشخیص اور علاج کی فکر سے غافل رہ سکتے ہیں جو حیوانات کی طرح اخلاقی حس سے بالکل خالی ہیں یا جن کے اخلاقی احساسات پر فالج گر گیا ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ پوری پوری قومیں بہت بڑے پیمانے پر اُن بدترین اخلاقی صفات کا مظاہرہ کر رہی ہیں جن کو ہمیشہ سے انسانیت کے ضمیر نے انتہائی نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ بے انصافی، بے رحمی، ظلم و ستم، جھوٹ، فریب، دغا، مکر، بدعہدی، خیانت، بے شرمی، نفس پرستی، استحصال بالجبر اور ایسے ہی دوسرے جرائم محض انفرادی جرائم نہیں رہے ہیں بلکہ قومی اخلاق کی حیثیت سے ظاہر ہو رہے ہیں۔ دنیا کی بڑی بڑی قومیں اجتماعی حیثیت سے وہ سب کچھ کر رہی ہیں جس کا ارتکاب کرنے والے افراد ابھی تک نکیلوں جیلوں میں ٹھونسے جاتے ہیں۔ ہر قوم نے چھانٹ چھانٹ کر اپنے بڑے سے بڑے مجرموں کو اپنا لیڈر اور سربراہ کار بنایا ہے اور ان کی قیادت میں بدمعاشی کی کوئی مکروہ سے مکروہ قسم ایسی نہیں رہ گئی ہے جس کا کھلم کھلا نہایت بے حیائی کے ساتھ وسیع پیمانے پر وہ ارتکاب کر رہی ہوں۔ ہر قوم دوسری قوم کے خلاف جھوٹ تصنیف کر کے علانیہ نشر کر رہی ہے اور ریڈیو کے ذریعہ سے ان جھوٹوں نے فضائے اثیر تک کو گندا کر دیا ہے۔ پورے پورے ملکوں اور براعظموں کی آبادیاں لٹیروں اور ڈاکوؤں میں تبدیل ہو گئی ہیں اور ہر ڈاکو عین اسوقت جبکہ وہ خود ڈاکہ مار رہا ہوتا ہے نہایت بے شرمی کے ساتھ اپنے مقابل کے ڈاکو کی اُن ساری گناہ گاریوں کا تذکرہ کرتا ہے جن سے داغدار ہونے میں اس کا اپنا دامن بھی اپنے حریف سے کچھ کم سیاہ نہیں ہوتا۔ انصاف کے معنی ان ظالموں کے نزدیک صرف اپنی قوم کے ساتھ انصاف کے رہ گئے ہیں۔ حق جو کچھ ہے ان کے لئے ہے۔ دوسروں کے حقوق پر ہر دست درازی ان کے اخلاقی قانون میں جائز بلکہ کارِ ثواب ہے۔

قریب قریب تمام قوموں کا حال یہ ہو چکا ہے کہ ان کے ہاں لینے کے پیمانے اور ہیں اور دینے کے اور۔ جتنے معیار وہ اپنے مفاد کے لئے قائم کرتی ہیں، دوسروں کے مفاد کا سوال سامنے آتے ہی وہ سب معیار بدل جاتے ہیں، اور جن معیاروں کا وہ دوسروں سے مطالبہ کرتی ہیں ان کی پابندی خود کرنا حرام سمجھتی ہیں۔ بدعہدی کا مرض اس حد کو پہنچ چکا ہے کہ اب ایک قوم کو دوسری قوم پر کوئی اعتماد باقی نہیں رہا۔ بڑی بڑی قوموں کے نمائندے نہایت مہذب صورتیں لئے ہوئے جب بین الاقوامی معاہدوں پر دستخط کر رہے ہوتے ہیں، اُس وقت ان کے دلوں میں یہ خبیث نیت چھپی ہوئی ہوتی ہے کہ پہلا موقع ملتے ہی اس مقدس بکرے کو قومی مفاد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھائیں گے، اور جب ایک قوم کا صدر یا وزیر اعظم اس قربانی کے لئے چھری تیز کرتا ہے تو پوری قوم میں سے ایک آواز بھی اس بداخلاقی کے خلاف نہیں اُٹھتی، بلکہ ملک کی پوری آبادی اس کے ساتھ اس جُرم میں شریک ہو جاتی ہے۔ مکاری کا حال یہ ہے کہ بڑے بڑے پاکیزہ اخلاقی اصولوں کی گفتگو کی جاتی ہے صرف اسلئے کہ دنیا کو بیوقوف بنا کر اپنے مفاد کی خدمت اُس سے لی جائے اور سادہ لوح انسانوں کو یقین دلایا جائے کہ تم سے جان و مال کی قربانی کا مطالبہ جو ہم کر رہے ہیں یہ کچھ اپنے لئے نہیں ہے بلکہ ہم بے غرض، نیکوں کے نیک لوگ یہ ساری تکلیفیں محض انسانیت کی بھلائی کے لئے برداشت کر رہے ہیں۔ سنگدلی و بیرحمی اس مرتبۂ کمال پر پہنچی ہے کہ ایک ملک جب دوسرے ملک پر حملہ آور ہوتا ہے تو اسکی آبادی کو روندنے اور کچلنے میں محض اسٹیم رولر کی سی بے حسی ہی اس سے ظاہر نہیں ہوتی بلکہ وہ نہایت مزے لے لے کر دنیا کو اپنے ان کارناموں کی اطلاع دیتا ہے، گویا اسے معلوم ہے کہ اب دنیا انسانوں سے نہیں بلکہ صرف بھیڑیوں سے آباد ہے۔ خودغرضانہ شقاوت اس انتہا کو پہنچ چکی ہے کہ ایک قوم دوسری قوم کو اپنے مفاد کے لئے مسخر کرنے کے بعد صرف یہی نہیں کہ بیدردی کے ساتھ اسے لوٹتی کھسوٹتی ہے بلکہ نہایت منظم طریقے سے پیہم کوشش کرتی رہتی ہے کہ انسانیت کے تمام شریفانہ خصائل سے اس کو خالی کر دے اور وہ تمام کمینہ اوصاف اسکے

اندر پرورش کرے جنہیں وہ خود نہایت گھناؤنا سمجھتی ہے۔

یہ چند نمایاں ترین اخلاقی خرابیاں میں نے محض نمونے کے طور پر بیان کی ہیں، ورنہ تفصیل کے ساتھ اگر جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ پوری انسانیت کا جسم اخلاقی حیثیت سے سڑ گیا ہے۔ پہلے قحبہ خانے اور قمار بازی کے اڈے اخلاقی پستی کے سب سے بڑے پھوڑے سمجھے جاتے تھے، لیکن اب تو ہم جدھر دیکھتے ہیں انسانی تمدن پورا کا پورا ہی ایک پھوڑا نظر آ رہا ہے۔ قوموں کی پارلیمنٹیں اور اسمبلیاں، حکومتوں کے سکرٹریٹ اور وزارت خانے، عدالتوں کے ایوان اور وکالت خانے، پریس اور نشرگاہیں، یونیورسٹیاں اور تعلیمی ادارے، بینک اور صنعتی و تجارتی کاروبار کے مجامع، سب کے سب پھوڑے ہی پھوڑے ہیں جو کسی تیز نشتر کا مطالبہ کر رہے ہیں۔ سب سے زیادہ افسوس کی بات یہ ہے کہ علم جو انسانیت کا عزیز ترین جوہر ہے آج اس کا ہر شعبہ انسانیت کی تباہی کے لئے استعمال ہو رہا ہے۔ طاقت اور زندگی کے تمام وسائل جو قدرت نے انسان کے لئے مہیا کئے تھے فساد اور خرابی کے کاموں میں ضائع کئے جا رہے ہیں۔ اور وہ صفات بھی، جو انسان کی بہترین اخلاقی صفات سمجھی جاتی تھیں، مثلاً شجاعت، ایثار، قربانی، فیاضی، صبر، تحمل، اولوالعزمی، بلند حوصلگی وغیرہ، آج ان کو بھی چند بڑی اور بنیادی بداخلاقیوں کا خادم بنا کر رکھ دیا گیا ہے۔

ظاہر ہے کہ اجتماعی خرابیاں اُس وقت اُبھر کر نمایاں ہوتی ہیں جب انفرادی خرابیاں پایۂ تکمیل کو پہنچ چکی ہوتی ہیں۔ آپ اس بات کا تصور نہیں کر سکتے کہ کسی سوسائٹی کے بیشتر افراد نیک کردار ہوں اور پھر وہ سوسائٹی بحیثیت مجموعی بدکرداری کا مظاہرہ کرے۔ یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ نیک کردار لوگ اپنی قیادت اور نمائندگی اور سربراہ کاری بدکردار لوگوں کے ہاتھ میں دے دیں، اور اس بات پر راضی ہو جائیں کہ ان کے قومی اور ملکی اور بین الاقوامی معاملات کو غیر اخلاقی اصولوں پر چلایا جائے۔ اس لئے جب وسیع پیمانے پر دنیا کی قومیں ان گھناونے اور رذیل اخلاقی اوصاف کا

اظہار اپنے اجتماعی اداروں کے ذریعہ سے کر رہی ہیں، تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آج نوع انسانی اپنی تمام علمی و تمدنی ترقیوں کے باوجود ایک شدید اخلاقی تنزل میں مبتلا ہے اور اس کے بیشتر افراد اس وبا سے متاثر ہو چکے ہیں۔ یہ حالت اگر یونہی ترقی کرتی رہی تو وہ وقت دور نہیں جب انسانیت کسی بہت بڑی تباہی سے دوچار ہوگی اور ایک طویل عہد ظلمت اس پر چھا جائے گا۔

اب اگر ہم آنکھیں بند کر کے تباہی کے گڑھے کی طرف سرپٹ جانا نہیں چاہتے تو ہمیں کھوج لگانا چاہیے کہ اس خرابی کا سرچشمہ کہاں ہے جہاں سے یہ طوفان کی طرح امڈی چلی آرہی ہے۔ چونکہ یہ اخلاقی خرابی ہے لہٰذا لامحالہ ہمیں اس کا سراغ اُن اخلاقی تصورات ہی میں ملے گا جو اس وقت دنیا میں پائے جاتے ہیں۔

دنیا کے اخلاقی تصورات کیا ہیں؟ اس سوال کی جب ہم تحقیق کرتے ہیں تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ اصولاً یہ تمام تصورات دو بڑی قسموں پر منقسم ہیں:

ایک قسم کے تصورات وہ جو خدا اور حیات بعد موت کے عقیدے پر مبنی ہیں

دوسری قسم کے تصورات وہ جو ان عقیدوں سے الگ ہٹ کر کسی دوسری بنیاد پر قائم ہوتے ہیں۔

آئیے اب ہم ان دونوں قسم کے تصورات کا جائزہ لے کر دیکھیں کہ دنیا میں اس وقت یہ کس صورت میں پائے جاتے ہیں اور ان کے نتائج کیا ہیں۔

خدا اور حیات بعد موت کے عقیدے پر جتنے اخلاقی تصورات قائم ہوتے ہیں انکی صورت کا تمام تر انحصار اُس عقیدے کی نوعیت پر ہوتا ہے جو خدا اور حیات بعد موت کے متعلق لوگوں میں پایا جاتا ہو۔ لہٰذا ہمیں دیکھنا چاہیے کہ دنیا اس وقت خدا کو کس شکل میں مان رہی ہے اور دوسری زندگی کے متعلق اس کے عام تخیلات کیا ہیں۔

خدا کو ماننے والے بیشتر انسان اِس وقت شرک میں مبتلا ہیں۔ انہوں نے اپنے زعم میں خدائی کے اکثر اختیارات، خصوصاً وہ اختیارات جن کا تعلق ان کی اپنی زندگی سے ہے، دوسری ہستیوں پر تقسیم کر دیئے ہیں اور اُن ہستیوں کا خیالی نقشہ اپنی خواہشات کے مطابق ایسا بنا لیا ہے کہ وہ اپنے اِن خدایانہ اختیارات کو ٹھیک اُسی طرح استعمال کرتی ہیں جس طرح یہ چاہتے ہیں کہ وہ استعمال کریں۔ یہ گناہ کرتے ہیں، وہ بخشوا لیتی ہیں۔ یہ فرائض سے غافل اور حقوق سے بے پروا ہو کر بے مہار جانور کی طرح حرام حلال کی تمیز کے بغیر دنیا کی کھیتی کو چرتے پھرتے ہیں اور وہ کچھ نذر و نیاز کے عوض اِن کی نجات کی ضمانت لے لیتی ہیں۔ یہ چوری بھی کرتے جاتے ہیں تو اُن کی عنایت سے تھانیدار سوتا رہ جاتا ہے۔ اُنکے اور ان کے درمیان یہ سودا طے ہو گیا ہے کہ یہ اُن کی طرف سے عقیدہ اچھا رکھیں اور نذر پیش کرتے رہیں، اور اس کے جواب میں وہ اِن کے سب کام، جو کچھ بھی یہ کرنا چاہیں، بناتی رہیں گی اور مرنے کے بعد جب خدا اِنہیں پکڑنا چاہے گا تو وہ بیچ میں حائل ہو کر کہہ دیں گی کہ یہ ہمارے دامن کے سایہ میں ہیں، اِن سے کچھ نہ کہا جائے۔ بلکہ بعض جگہ تو اس پکڑ دھکڑ کی نوبت ہی نہ آئے گی کیونکہ ان کے گناہوں کا کفارہ پہلے ہی کوئی ادا کر چکا ہے۔ اِن مشرکانہ عقائد نے زندگی بعد موت کے عقیدے کو بھی بے معنی کر دیا ہے، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ ساری اخلاقی بنیادیں کھوکھلی ہو چکی ہیں جو مذہب نے تعمیر کی تھیں۔ مذہبی اخلاقیات کتابوں میں لکھے ہوئے موجود ہیں، اور زبانوں پر اُن کا ذکر بھی احترام کے ساتھ آتا ہے مگر عملاً ان کی پابندی سے بچنے کے لئے شرک نے فرار کی بے شمار راہیں فراہم کر دی ہیں اور کچھ اس شان سے فراہم کی ہیں کہ جس راہ سے بھی یہ چاہیں بھاگیں، بہر حال انہیں اطمینان ہے کہ آخر کار پہنچیں گے نجات ہی کی منزل پر۔

شرک سے قطع نظر، جہاں خدا پرستی اور عقیدۂ آخرت کچھ بہتر صورت میں موجود ہے، وہاں بھی ہم دیکھتے ہیں کہ خدا کے مطالبات سُکڑ کر انسانی زندگی کے ایک بہت چھوٹے دائرے میں محدود ہو گئے

ہیں۔ چند اعمال، چند رسوم، اور چند پابندیاں ہیں جن کا، محدود انفرادی و معاشرتی زندگی میں خدا ان سے مطالبہ کرتا ہے اور انہی کے معاوضے میں اس نے ایک بہت بڑی جنت ان کے لئے مہیا کر رکھی ہے۔ اگر یہ اُن مطالبوں کو پورا کر دیں تو پھر کوئی چیز خدا کی طرف سے ان کے لئے کرنے کی نہیں رہ جاتی، اس کے بعد یہ آزاد ہیں کہ اپنی زندگی کے معاملات جس طرح چاہیں چلائیں۔ اور اگر اُن خدائی مطالبوں میں بھی کوتاہی رہ جائے تو اس کی رحمت اور نکتہ نوازی پر بھروسا ہے کہ وہ گن ہوں کے پشتارے ان سے جنت کے دروازے پر رکھوالیگا اور اندر جانے کے لئے اعزازی ٹکٹ عنایت فرما دیگا۔ اس تنگ مذہبی تصور نے اول تو زندگی کے معاملات پر مذہبی اخلاقیات کے انطباق کو بہت محدود کر دیا ہے جس کی وجہ سے زندگی کے تمام بڑے بڑے شعبے ہر اس اخلاقی رہنمائی اور بندش سے آزاد ہو گئے ہیں جو مذہب سے حاصل ہو سکتی تھی، دوسرے اس تنگ دائرے میں بھی اخلاق کی گرفت سے بچ نکلنے کے لئے ایک راستہ یہاں کُھلا ہوا ہے جس سے فائدہ اٹھانے میں کم ہی لوگ سستی دکھلاتے ہیں۔

ان سب سے بہتر حالت جن مذہبی طبقوں کی ہے، جو شرک سے بھی پاک ہیں، سچائی کے ساتھ خدا کو بھی مانتے ہیں، اور آخرت کے متعلق بھی کسی جھوٹے بھروسے پر تکیہ نہیں کر بیٹھے ہیں، اُن کے اندر اخلاق کی پاکیزگی تو بے شک پائی جاتی ہے، اور بہترین سیرت و کردار کے لوگ اُن میں مل جاتے ہیں، لیکن ان کو بالعموم مذہب و روحانیت کے محدود تصور نے خراب کر رکھا ہے۔ وہ دنیا اور اسکے مسائل زندگی سے بڑی حد تک بے تعلق ہو کر یا تو چند مخصوص کاموں کو، جنہیں مذہبی کام سمجھا جاتا ہے لے بیٹھے ہیں، یا اپنے نفس کو مانجھ مانجھ کر صاف کرتے ہیں تاکہ وہ اس دنیا ہی میں عالمِ غیب کی آوازیں سُننے اور حسنِ مطلق کی پرچھائیاں دیکھنے کے قابل ہو جائیں۔ ان کے نزدیک نجات کا راستہ دنیوی زندگی کے کنارے کنارے بچکر نکل جاتا ہے اور خدا کے قرب سے سرفراز ہونیکی سبیل بس یہ ہے کہ ایک طرف مذہب کے دیے ہوئے نقشے پر اپنی زندگی کے ظاہری پہلوؤں کو ڈھال لیا جائے،

دوسری طرف نفس کی صفائی کے چند طریقوں سے کام لے کر اسے مجلّٰی و مصفّٰی کر لیا جائے، اور پھر ایک محدود دائرے کے اندر کچھ مذہبی و روحانی مشاغل میں مصروف رہ کر زندگی کے دن پورے کر دیے جائیں۔ گویا ان کے خدا کو چند خوش وضع شیشے کے برتن، چند مقطّع لاؤڈ سپیکر، چند عمدہ گراموفون، چند لطیف ریڈیو سیٹ، چند خوشنما فوٹو کے کیمرے درکار تھے اور اسی غرض کے لیے اس نے زمین میں اتنا کچھ سامان دے کر انسانوں کو بھیجا تاکہ یہاں سے اپنے آپ کو ان چیزوں میں تبدیل کر کے پھر اس کے پاس واپس پہنچ جائیں۔ مذہب و روحانیت کے اس غلط تصوّر کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوا ہے کہ جو نفوس بلند تر اور پاکیزہ تر اخلاقی صلاحیتوں کے حامل تھے انہیں زندگی کے میدان سے ہٹا کر گوشوں میں لے گیا اور گھٹیا درجے کے اخلاقی اوصاف رکھنے والوں کے لیے بغیر مزاحمت کے خود بخود میدان خالی ہو گیا۔

دنیا کی پوری مذہبی صورتِ حالات کا یہ لبِّ لباب ہے اور اس سے آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ خدا پرستی سے جو اخلاقی طاقت انسان کو ملنی ممکن تھی بیشتر انسان تو اس کو سرے سے حاصل ہی نہیں کر رہے ہیں، اور ایک بہت قلیل تعداد اس کو حاصل کر رہی ہے لیکن انسانیت کی رہنمائی و سربراہ کاری سے وہ خود دست بردار ہو گئی ہے اس لئے اس کا حال اس بیٹری کا سا ہے جس میں بجلی بھری جائے اور وہ یونہی رکھے رکھے اپنی عمر پوری کر دے۔

انسانی تمدن کی گاڑی بالفعل جو لوگ اس وقت چلا رہے ہیں اُن کے اخلاقیات خدا اور آخرت کے اساسی تخیل سے خالی ہیں اور دانستہ خالی کیے گئے ہیں، نیز اخلاق میں خدا کی رہنمائی قبول کرنے سے انہوں نے قطعی انکار کر دیا ہے۔ اگرچہ ان میں کثیر التعداد لوگ کسی نہ کسی مذہب کے قائل ہیں مگر اُن کے نزدیک مذہب ہر انسان کا محض ایک شخصی و انفرادی معاملہ ہے جسے اپنی ذات تک آدمی کو محدود رکھنا چاہیے، اجتماعی زندگی اور اسکے معاملات سے مذہب کو کوئی سروکار ہی نہیں ہے

پھر اس کی کیا ضرورت کہ وہ اِن معاملات کو چلانے کے لئے کسی فوق الفطری ہدایت کی طرف رجوع کریں۔
گذشتہ صدی کے اواخر میں جس اخلاقی تحریک کی ابتدا امریکہ سے ہوئی تھی اور جو بڑھتے بڑھتے انگلستان
اور دوسرے ممالک میں پھیل گئی، اس کا بنیادی مسلک AMERICAN ETHICAL UNION کے
مقاصد کی فہرست میں بایں الفاظ واضح کیا گیا تھا:

"انسانی زندگی کے تمام تعلقات میں، خواہ وہ شخصی ہوں، اجتماعی ہوں، قومی ہوں یا بین الاقوامی، اخلاق کی انتہائی اہمیت پر زور دینا بغیر اس کے کہ مذہبی معتقدات یا مابعد الطبیعی تخیلات کا اس میں کوئی دخل ہو"

اس تحریک کے زیر اثر انگلستان میں UNION OF ETHICAL SOCIETIES قائم
ہوئی جو بعد میں ETHICAL UNION میں ضم ہو گئی۔ اس کا اساسی مقصد یہ بیان کیا گیا تھا:

"انسانی رفاقت اور خدمت کے ایک ایسے طریقے کی تلقین کرنا جو اس اصول پر مبنی ہو کہ سب سے بڑا مقصد بھلائی کی محبت ہے، اور یہ کہ اخلاقی تصورات اور اخلاقی زندگی کے لئے دنیا کی حقیقت اور زندگی بعد موت کے متعلق کسی عقیدے کی حاجت نہیں ہے، اور یہ کہ خالص انسانی اور فطری ذرائع سے انسانوں کو اپنے تمام تعلقاتِ زندگی میں حق سے محبت کرنے، حق جاننے اور حق پر عمل کرنے کے لئے تیار کیا جائے"

ان الفاظ میں درحقیقت اُس پورے طبقے کی نمائندگی کی گئی ہے جو اسوقت دنیا کے افکار، تہذیب، تمدن
اور معاملات کی رہنمائی کر رہا ہے۔ آج دنیا کے کاروبار کو عملاً جو لوگ چلا رہے ہیں ان سب کے ذہن پر وہی
تخیل چھایا ہوا ہے جو اوپر کے چند فقروں میں بیان کیا گیا ہے۔ سب ہی نے بالفعل اپنے اخلاقیات کو خدا
اور آخرت کے عقیدے اور مذہب کی اخلاقی رہنمائی سے آزاد کر لیا ہے۔ اب ہمیں ان اخلاقی فلسفوں کا، جنہیں
مذہب سے آزاد ہو کر انہوں نے اختیار کیا ہے، جائزہ لے کر دیکھنا چاہئے کہ ان کی کیا کیفیت ہے۔

فلسفۂ اخلاق کا پہلا بنیادی سوال یہ ہے کہ وہ اصلی اور انتہائی بھلائی کیا ہے جس کو پہنچنا انسانی سعی و عمل کا مقصود ہونا چاہیے اور جس کے معیار پر انسان کے طرزِ عمل کو پرکھ کر فیصلہ کیا جائے کہ وہ اچھا ہے یا برا، صحیح ہے یا غلط؟

اس سوال کا کوئی ایک جواب انسان نہیں پا سکا۔ اسکے بہت سے جوابات ہیں۔ ایک گروہ کے نزدیک وہ بھلائی خوشی ہے، دوسرے کے نزدیک کمال ہے، تیسرے کے نزدیک فرض برائے فرض ہے۔

پھر خوشی کے متعلق مختلف سوالات پیدا ہوتے ہیں کہ کیسی خوشی؟ آیا وہ جو جسمانی و نفسانی خواہشات کے پورا ہونے سے حاصل ہوتی ہے؟ یا وہ جو ذہنی ترقی کے مدارج پر چڑھنے سے حاصل ہوتی ہے؟ یا وہ جو اپنی شخصیت کو آرٹ یا روحانیت کے نقطۂ نظر سے آراستہ کر لینے سے حاصل ہوتی ہے؟ نیز یہ کہ کس کی خوشی؟ آیا ہر شخص کی اپنی خوشی؟ یا اس جماعت کی خوشی جس سے انسان وابستہ ہے؟ یا تمام انسانوں کی خوشی؟ یا فی الجملہ دوسروں کی خوشی؟

اسی طرح کمال کو مقصود قرار دینے والوں کے لئے بھی بہت سے سوالات پیدا ہوتے ہیں۔ کمال کا تصوّر اور اس کا معیار کیا ہے؟ اور کمال کس کا مقصود ہے؟ فرد کا؟ جماعت کا؟ یا انسانیت کا؟

اسی طرح جو لوگ فرض برائے فرض کے قائل ہیں اور ایک غیر مشروط واجب الاطاعت قانونِ فرض (CATEGORICAL IMPERATIVE) کی بے چون وچرا اطاعت ہی کو آخری و انتہائی بھلائی قرار دیتے ہیں ان کے لئے بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ قانون فی الواقع ہے کیا؟ کس نے اس کو بنایا؟ اور کس کا قانون ہونے کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت ہے؟

ان تمام سوالات کے جوابات مختلف گروہوں کے نزدیک مختلف ہیں۔ محض فلسفہ کی کتابوں ہی میں مختلف نہیں ہیں بلکہ عملاً بھی مختلف ہیں۔ یہ ساری انسانوں کی بھیڑ جو آپکے سامنے تمدنِ انسانی کی گاڑی کو چلا رہی ہے، جس میں سلطنتوں کو چلانے والے وزیر، فوجوں کو لڑانے والے جنرل، انسانوں کے درمیان فیصلہ کرنے والے جج، انسانی معاملات کے لئے قانون بنانے والے شارعین، انسانوں کو تیار کرنے والے معلم، انسان کے معاشی ذرائع کو کنٹرول

کرنے والے کاروباری لوگ، اور تمدن کے کارخانے میں کام کرنے والے مختلف مدارج کے کارکن سب ہی شامل ہیں۔ انکے پاس بھلائی کا کوئی ایک معیار نہیں ہے بلکہ ہر ایک شخص اور ہر ایک گروہ اپنا الگ معیار رکھتا ہے اور ایک تمدنی نظام میں کام کرتے ہوئے بھی ہر ایک کا رُخ ایک الگ مقصود کی طرف پھرا ہوا ہے۔ کسی کے نزدیک اپنی خوشی منتہا ہے اور خوشی سے اسکی مراد نفسانی وجسمانی خواہشات کی تکمیل ہے۔ کوئی اپنی خوشی کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور اس سے اسکے ذہن میں کچھ اور مراد ہے۔ اس ذاتی خوشی کے حصول وعدم حصول کے لحاظ سے وہ فیصلہ کرتا ہے کہ اجتماعی زندگی میں اس کیلئے کونسا طرزِ عمل ٹھیک ہے یا بد۔ مگر اسکی ظاہری شریفانہ صورت سے ہم اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں کہ انسانی سوسائٹی کیلئے وہ ایک موزوں وزیر یا جج یا معلّم یا کسی دوسری حیثیت سے تمدن کی مشین کا ایک اچھا پرزہ ہے۔ اسی طرح کوئی خوشی سے مراد انسانوں کے اُس مخصوص مجموعہ کی خوشی وخوشحالی سمجھتا ہے جس کے ساتھ اسکی دلچسپیاں وابستہ ہیں اور بس اسکے نزدیک وہ خیر برتر ہے جسکے حصول کی سعی کرنا اسکے نزدیک نیکی ہے۔ یہ نقطۂ نظر اسے اپنے جتھے یا اپنی قوم کے سوا ہر ایک کیلئے سانپ اور بچھو بنا دیتا ہے لیکن ہم اسکی ظاہری مہذب صورت کی وجہ سے اسکو ایک شریف انسان فرض کر لیتے ہیں۔ ایسی ہی مختلف اقسام کی شخصیتیں کمال کو خیر اعلیٰ ماننے والوں اور فرض برائے فرض کے قائلین میں پائی جاتی ہیں جن میں اکثر کے نظریات اپنے عملی نتائج کے اعتبار سے انسانی تہذیب وتمدن کے لیے زہر کا حکم رکھتے ہیں مگر وہ تریاق کا لیبل لگائے ہوئے ہماری اجتماعی زندگی میں جذب ہوتے چلے جا رہے ہیں۔

اب آگے چلیے۔ فلسفۂ اخلاق کے بنیادی سوالات میں سے دوسرا اہم سوال یہ ہے کہ ہمارے پاس خیر وشر کے جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ کس ماخذ کی طرف ہم یہ معلوم کرنے کیلئے رجوع کریں کہ اچھا کیا ہے اور بُرا کیا، صحیح کیا ہے اور غلط کیا؟

اس سوال کا بھی کوئی ایک جواب انسان کو نہیں ملا۔ اسکے بھی بہت سے جوابات ہیں۔ کسی کے نزدیک وہ ذریعہ اور ماخذ انسانیت کا تجربہ ہے، کسی کے نزدیک قوانین حیات اور حالات وجود کا علم ہے، کسی کے نزدیک وجدان ہے، کسی کے نزدیک عقل ہے۔ یہاں پہنچکر وہ بدنظمی اپنی انتہا کو پہنچ جاتی ہے جس کا آپ نے پہلے سوال کے معاملہ میں مشاہدہ کیا۔ اِن چیزوں کو ماخذ قرار دینے کے بعد اخلاق کے لئے مستقل اصول بھی یہ قرار پا جاتا ہے کہ اس کا کوئی متعین معیار

نہ ہو بلکہ وہ ایک سیّال مادّے کی طرح بہتا اور مختلف صورتوں اور پیمانوں میں ڈھلتا چلا جائے ۔

انسانیت کے تجربے سے صحیح علم حاصل کرنے کیلئے ناگزیر ہے کہ اسکے متعلق مکمل اور مفصل معلومات یکجا جمع ہوں اور کوئی ہمہ بیں اور کامل متوازن ذہن ان سے نتائج اخذ کرے۔ لیکن یہ دونوں چیزیں حاصل نہیں ہیں۔ اوّل تو انسانیت کا تجربہ ابھی ختم نہیں ہوا ہے بلکہ جاری ہے۔ پھر اب تک کا جو تجربہ ہے اسکے بھی مختلف اجزاء مختلف لوگوں کے سامنے ہیں اور وہ مختلف طور پر اپنی ذہنیت کے مطابق ان سے نتائج نکال رہے ہیں۔ تو کیا ان ناقص معلومات سے مختلف نامکمل ذہن اپنے رجحانات کے مطابق جو نتائج بھی اخذ کرلیں وہ سب صحیح ہوسکتے ہیں؟ اگر نہیں، تو کیسے سخت بیمار ہیں وہ ذہن جو اپنے خیر و شر کو جاننے کے لئے اس ذریعۂ علم کو کافی سمجھتے ہیں ۔

یہی معاملہ قوانین حیات اور حالات وجود کا ہے۔ بتاؤ آپ اخلاقی بھلائی اور برائی کو جاننے کیلئے اُسوقت کا انتظار کریں جب ان قوانین اور حالات کا علم قابل اطمینان حد تک آپکی گرفت میں آجائے، یا نہیں تو ناکافی معلومات کو ناکافی جانتے ہوئے انہی کی بنیاد پر مختلف ذہنیت اور مختلف مراتب علمی کے لوگ مختلف طور پر فیصلے کرتے رہیں کہ ان کیلئے خیر کیا ہے اور شر کیا، اور علم کی ہر نئی قسط حاصل ہونیکے بعد ان فیصلوں کو بدلتے بھی رہیں حتیٰ کہ آج کا خیر کل شر ہو جائے اور آج کا شر کل خیر قرار پائے ۔

عقل اور وجدان کا معاملہ بھی اس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ بلاشبہ خیر و شر کو جاننے کی کچھ استعداد عقل کو بھی حاصل ہے اور اس عقل سے ہر انسان نے کچھ نہ کچھ حصہ پایا ہے، اور خیر و شر کا کچھ علم وجدانی بھی ہے جس کا الہام ہر انسان کے ضمیر پر فطرۃً ہوتا ہے، لیکن اس علم کیلئے ان میں سے کوئی بھی کافی بالذات نہیں ہے کہ اسی کو آخری اور واحد ذریعۂ علم کی حیثیت سے لیا جائے۔ عقل یا وجدان، جس کو بھی آپ کافی بالذات سمجھیں گے، بہرحال ایک ایسے ذریعۂ علم پر آپ اعتماد کرینگے جو نہ صرف یہ کہ اپنی فطرت میں ناقص و محدود ہے، بلکہ وہ مختلف اشخاص، مختلف طبقوں، مختلف حالات اور مختلف زمانوں میں پہنچکر بالکل مختلف چیزوں پر خیر یا شر ہونے کا حکم لگاتا ہے ۔

یہ ساری بدنظمی جس کا میں نے ابھی آپ سے ذکر کیا ہے، محض علمی مقالات اور فلسفیانہ بحثوں تک ہی

محدود نہیں ہے بلکہ فی الواقع دنیا کے تمدن و تہذیب میں عملاً اس کا عکس پوری طرح نمایاں ہو رہا ہے۔ آپکے تمدن میں جو لوگ کام کر رہے ہیں، خواہ وہ کارفرمائی کے مقام پر ہوں یا کارکنی کے مقام پر یا کارفرماؤں اور کارکنوں کے بنانے میں لگے ہوتے ہوں، یہ سب خیر و شر اور صحیح و غلط کو جاننے کے لئے اپنے اپنے طور پر اپنی مختلف ماخذوں کی طرف رجوع کر رہے ہیں؛ اور ہر شخص اور ہر گروہ کا خیر و شر دوسرے کے خیر و شر سے الگ ہے، حتیٰ کہ ایک کا خیر دوسرے کا انتہائی شر ہے اور ایک کا شر دوسرے کا انتہائی خیر۔ اس بدنظمی نے اخلاق کیلئے کوئی پائیدار بنیاد باقی ہی نہیں رہنے دی ہے۔ جن چیزوں کو دنیا ہمیشہ سے شرمناک بداخلاقی سمجھتی آئی ہے یا جنہیں ہمیشہ سے جرم اور گناہ سمجھا جاتا رہا ہے آج کسی نہ کسی گروہ کی نگاہ میں وہ عین خیر ہیں یا مطلقاً خیر نہیں تو اضافی خیر بن گئی ہیں۔ اسی طرح جن بھلائیوں کو ہمیشہ سے انسان خوبی سمجھتا رہا ہے ان میں سے اکثر آج حماقت اور مضحکہ قرار پا چکی ہیں اور مختلف گروہ ان کو شرم کے ساتھ نہیں بلکہ فخر کے ساتھ علانیہ پامال کر رہے ہیں۔ پہلے جھوٹا جھوٹ بولتا تھا مگر معیار اخلاق سچائی ہی کو مانتا تھا۔ لیکن آج کے فلسفوں نے جھوٹ کو خیر بنا دیا ہے اور جھوٹ بولنے کا ایک مستقل فن مدوّن کیا جا رہا ہے اور بڑے پیمانے پر قومیں اور سلطنتیں جھوٹ پھیلا رہی ہیں۔ یہی حال ہر بداخلاقی کا ہے کہ پہلے بداخلاقیاں، بداخلاقیاں ہی تھیں مگر آج نئے فلسفوں کے طفیل میں وہ سب مطلق یا اضافی خیر میں تبدیل کر دی گئی ہیں۔

فلسفۂ اخلاق کے بنیادی سوالات میں سے تیسرا سوال یہ ہے کہ قانون اخلاق کے پیچھے وہ قوت کونسی ہے جس کے زور سے یہ قانون نافذ ہو؟ اسکے جواب میں مسرت اور کمال کے پرستار کہتے ہیں کہ خوشی یا کمال کی طرف لے جانے والی بھلائیاں اپنی پیروی کرانے کی طاقت آپ رکھتی ہیں اور رنج یا پستی کی طرف لے جانے والی برائیاں آپ اپنے ہی زور پر اپنے سے اجتناب کرا لیتی ہیں۔ اسکے سوا قانون اخلاق کے لئے کسی خارجی اقتدار کی ضرورت ہی نہیں۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ قانون فرض انسان کے ارادۂ معقول کا اپنے اوپر آپ عائد کردہ قانون ہے، اس کے لئے کسی بیرونی زور کی حاجت نہیں۔ تیسرا گروہ سیاسی اقتدار کو قانون اخلاق کی اصل قوت نافذہ سمجھتا

ہے اور اس مسلک کی رُو سے اسٹیٹ کی طرف وہ تمام اختیارات منتقل ہو جاتے ہیں جو پہلے خدا کے لئے تھے، یعنی باشندوں کے حق میں یہ فیصلہ کرنا کہ انہیں کیا کرنا چاہیے اور کیا نہ کرنا چاہیے۔ چوتھے گروہ نے یہ مرتبہ اسٹیٹ کے بجائے سوسائٹی کو دیا ہے۔ یہ سب جوابات فساد کی بے شمار صورتیں دنیا میں عملاً پیدا کر چکے ہیں اور اب تک کر رہے ہیں۔ پہلے دونوں جوابوں نے انفرادی خودسری و بے راہ روی یہاں تک بڑھادی کہ اجتماعی زندگی کا شیرازہ درہم برہم ہونے کے قریب پہنچ گیا۔ پھر اس کا ردعمل اُن فلسفوں کی صورت میں رونما ہوا جنہوں نے یا تو اسٹیٹ کو خدا بنا کر افراد کو بالکل اس کا بندہ بنا ڈالا، یا پھر افراد کی رتی کے ساتھ ان کے خیر و شر کی باگیں بھی اجتماع کے ہاتھوں میں دیدیں، حالانکہ سبوح و قدوس نہ اسٹیٹ ہے نہ اجتماع۔

یہی معاملہ اس سوال کے جواب میں پیش آتا ہے کہ وہ کونسا محرک ہے جو انسان کو اپنے طبعی رجحانات کے علی الرغم اخلاقی احکام کی پابندی پر آمادہ کرے؟ کسی کے نزدیک بس خوشی کی طمع اور رنج و تکلیف کا خوف اس کیلئے کافی محرک ہے۔ کوئی محض کمال کی خواہش اور نقص سے بچنے کی تمنا کو اس کے لئے کافی سمجھتا ہے۔ کوئی اس کے لئے محض آدمی کے اپنے جذبۂ احترام قانون پر اعتماد کرتا ہے۔ کوئی اسٹیٹ کے اجر کی امید اور اسکے غضب کے خوف کو اہمیت دیتا ہے۔ اور کوئی اجتماع کے اجر اور اسکے غضب کو طمع و خوف کے لئے استعمال کرنے پر زیادہ زور دیتا ہے۔ ان میں سے ہر جواب نے عملاً ہمارے اخلاقی نظامات میں سے کسی نہ کسی کے اندر تقدم کا مقام حاصل کیا ہے، اور تھوڑا سا تجسس کرنے پر یہ حقیقت باآسانی کھل سکتی ہے کہ یہ سب محرکات بداخلاقی کے لئے بھی اتنے ہی اچھے محرک بن سکتے ہیں جتنے خوش اخلاقی کے لئے۔ بلکہ ان میں بداخلاقی کے لئے محرک بننے کی قوت بہت زیادہ ہے۔ اور بہرحال کسی اعلیٰ درجہ کی اخلاقیت کے لئے تو یہ تمام محرکات قطعاً ناکافی ہیں۔

یہ بہت مختصر جائزہ جو میں نے دنیا کی موجودہ اخلاقی حالت کا لیا ہے اس سے بیک نظر یہ محسوس ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اسوقت ایک ہمہ گیر اخلاقی انتشار پایا جاتا ہے۔ خدا سے بے نیاز ہو کر انسان کوئی ایسی بنیاد نہیں پاسکا جس پر وہ قابلِ اطمینان طریقہ سے اپنے اخلاق کی تعمیر کرتا۔ اخلاق کے سارے بنیادی سوالات اس کے لئے

حقیقتاً لاجواب ہو کر رہ گئے۔ نہ وہ اُس خیر و برتر کا کہیں سراغ لگا سکا جو اسکی کوششوں کا منتہا بننے کے قابل ہوتا اور جس کے لحاظ سے اعمال کے نیک یا بد اور صحیح یا غلط ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا۔ نہ اُسے وہ ماخذ کہیں ہاتھ لگا جس سے وہ صحیح طور پر معلوم کر سکتا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا۔ نہ اُسے وہ اقتدار فراہم کرنے میں کامیابی ہوئی جس کے امضاء (SANCTION) سے اخلاق کے کسی بلند، جامع اور عالمگیر ضابطہ کو قوت نفاذ حاصل ہوتی۔ اور نہ اسے کوئی ایسا محرک مل سکا جو انسانوں میں راستی پر عمل کرنے اور ناراستی سے پرہیز کرنے کے لئے حقیقی آمادگی پیدا کرنے کے قابل ہو۔ خدا سے بغاوت کر کے انسان نے خود سری کے ساتھ ان سوالات کو حل کرنا چاہا اور اپنے نزدیک حل کیا بھی، مگر یہ اسی حل کے پیدا کردہ نتائج ہیں جو آج ہم کو اخلاقی تنزل کے ایک خوفناک طوفان کی شکل میں اٹھتے اور پوری انسانی تہذیب کو تباہی کی دھمکیاں دیتے نظر آ رہے ہیں۔

کیا اب بھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم اس بنیاد کو تلاش کریں جس پر انسانی اخلاق کی صحیح تعمیر ہو سکے؟ فی الواقع یہ تلاش و جستجو محض ایک علمی بحث نہیں ہے بلکہ ہماری زندگی کی ایک عملی ضرورت ہے اور وقت کی نزاکت نے اس کو اہم ترین ضرورت بنا دیا ہے۔ اسی لحاظ سے میں اپنی تلاش کے نتائج پیش کرتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ جو لوگ اس ضرورت کو محسوس کر رہے ہیں وہ نہ صرف میرے ان نتائج پر ٹھنڈے دل سے غور کریں بلکہ خود بھی سوچیں کہ اخلاقِ انسانی کے لئے آخر کونسی بنیاد صحیح ہو سکتی ہے۔

(باقی آئندہ)

بہار میں

جماعت اسلامی کا تمام لٹریچر، ہر طرح کے قرآن پاک سارے ہندوستان کی اسلامی مطبوعات و دیگر پاکیزہ علمی ادبی کتابیں بچوں اور عورتوں کی اخلاقی کُتب

مکتبہ اسلامی لہریا سرائے دربھنگہ

سے مل سکتی ہیں